بحث ونظر

قرآن مجید کی ادبیت

ڈاکٹر عبد المغنی

خطبہ

قرآن مجید ایک ایسا خطبہ ہے جو خالق کائنات اور مالک لوح و قلم کی جانب سے ایک فرشتے کے ذریعے واضح لفظوں میں ایک ایسے انسان پر مسلسل تیئس ۲۳ سال تک وحی کیا جاتا رہا جو انسان کامل اور خاتم المرسلین تھے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس خطبے کی نوعیت یہ تھی کہ خدا پرستی کی ہمہ گیر تحریک کے دوران میں جس وقت جو صورت حال پیش آئی اس کے متعلق ایک ہدایت نامہ نازل کر دیا گیا اور اللہ کے رسول نے اس کے منشا کو سمجھ کر ضرورت اور موقعے کے مطابق اس کی تشریح بھی کی اور تعمیل بھی۔ یہ خطبہ ایک ایسی زبان میں ارشاد کیا گیا جو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں بہترین زبان تھی اور جس کے بولنے والے اپنی زبان آوری کے سبب ہی عرب کہلاتے تھے۔ گرچہ عربوں کا تحریری سرمایہ بہت کم تھا، مگر شاعری اور خطابت کے فنون ان کے معاشرے میں اس درجہ رائج تھے کہ شجاعت اور سخاوت کے ساتھ ادبیت کا شماران کے مکارم اخلاق میں ہوتا تھا، بلکہ شجاعت و سخاوت کے جو کارنامے عربی سماج میں انجام دئے جاتے تھے ان کو زبان دینے والی چیز ادبیت ہی تھی، جس کے بغیر کسی کارنامے کا کوئی اعتبار قائم نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سخن وری اور ادب پروری عربوں کا سب سے بڑا تہذیبی شعار تھا۔ چناں چہ جہاں ان کے درمیان بڑے بڑے شعرا اور خطیبوں کی کثرت تھی وہیں ادب کا پختہ ذوق رکھنے والے صاحب نظر نقادوں کی بھی کمی نہ تھی۔ لہٰذا داد سخن اسی خطیب یا شاعر کو ملتی تھی جو اپنے فن میں ماہر ہو اور اظہار و بیان پہ پوری قدرت رکھتا ہو۔

خطبہ وشاعری کا عربوں کی ادبی خصوصیت اور امتیازی شان ہونا تاریخی طور پر ان کے لیے ایک رحمت ثابت ہوا، جب کہ اس کے برخلاف یونان، ایران اور ہندوستان کے ڈرامے اور افسانے ان ملکوں کے باشندوں کے لیے لسانی نقطۂ نظر سے کسی برکت کا باعث نہ ہوئے۔ ڈیڑھ ہزار سال قبل کی دنیا میں نشرواشاعت کے وسائل بہت محدود اور ناقص تھے، لہٰذا اس عہد قدیم میں ادب پاروں کے اصل متن کی حفاظت نہایت مشکل تھی۔ اس تاریخی حقیقت کے علاوہ جغرافیائی لحاظ سے یہ ایک عمرانی واقعہ ہے کہ عربوں کے حافظے کا مقابلہ اجتماعی طور پر کوئی قوم نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں عربی زبان کی یہ اہمیت بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ آرامی، سریانی اور عبرانی وغیرہ تمام قدیم ترین زبانوں کی سب سے ترقی یافتہ شکل عربی ہی ہے، جس نے ان زبانوں کے تمام لسانی وسائل اپنے اندر جذب کر لیے جو اب ناپید یا مردہ ہو چکی ہیں، جب کہ عربی کی ثروت اور قوت کا عالم یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال اور اس کے بھی قبل سے اس کی مسلسل ترقی ہو رہی ہے، یہاں تک کہ قدیم اور جدید عربی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں، لیکن دوسری قدیم زبانیں اپنی تابندگی کھو چکی ہیں اور ان کے پرانے ناموں سے جو زبانیں آج پائی جاتی ہیں وہ اپنی پرانی شکلوں میں آثار قدیمہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس واقعے کا علمی مطالعہ اور تاریخی تجزیہ کرنے سے واضح ہو گا کہ دور قدیم میں کتابی ذخیرے میں بند رہنے کے بجائے لوگوں کی زبانوں پر ہونا عربی کے بہت کام آیا، اس لیے کہ اس طرح اس کا مسلسل استعمال ہمواری کے ساتھ ہوتا رہا اور کتابی زبان بول چال کی زبان سے مختلف نہیں ہوئی، عربی تقریر میں وہی فصاحت و بلاغت سیکڑوں سال سے چلی آ رہی ہے جو عربی تحریر میں ہے۔

مجموعی وعمومی طور پر زبان کی اس فصاحت و بلاغت نے عربی میں نثر و نظم کے فاصلے بہت کم کر دیے ہیں یہی وجہ ہے کہ اظہار و بیان کی جو خوبیاں عربی شاعری میں پائی جاتی ہیں وہی عربی خطبے میں بھی ہیں یا خطبے میں جو خوبیاں ہیں وہی شاعری میں بھی ہیں۔ یہ محاسن خطابت (Rhetoric) کے ساتھ ساتھ سلاست (fluency) کے بھی ہیں، بلکہ عربی ادب میں یہ دونوں محاسن ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ لہٰذا عربی زبان میں نظم کی پیچیدگی اور نثر کی سادگی کے باہمی تضاد کا وہ مسئلہ نہیں ہے جو دیگر زبانوں کی بدیع و بیان کی بحثوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح

دیگر زبانوں میں عروض (Prosody) اور علم البیان (Rhetoric) کو ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ فرض کیا جاتا ہے، مگر عربی میں خطبہ و شاعری کے اندر لبسا اوقات یہ دونوں علوم شیر و شکر نظر آتے ہیں اور ان کے اس امتزاج کی وجہ سے ایسا کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا کہ نظم و نثر کی الگ الگ قسمیں کرکے بعض کی تحسین اور بعض پر تنقید کی جائے، بلکہ اگر امتزاج کے سبب ادائے مطلب میں زور، اثر اور حسن پیدا ہو تو اس کو زیادہ سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک ہم آہنگ طرز اظہار کو سب سے زیادہ معیاری اسلوب بیان تصور کیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہی ہے جو اپنی اصل نوعیت کے لحاظ سے خطبۂ خداوندی ہونے کے باوجود عرب کے بعض نقادانِ ادب کو شاعری کی طرح سحر انگیز محسوس ہوتا تھا۔ خدا نے خود اس کے سحر یا شاعری ہونے کی تردید کی ہے اور قرآن کو ایک "ذکر" قرار دیا ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ (تکویر: ۲۷)	یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے
اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ	رہا یہ ذکر تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور
لَحَافِظُوْنَ (الحجر: ۹)	ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

'ذکر' ادب کی کسی مخصوص صنف یا ہیئت اظہار کا نام نہیں ہے۔ اسی معنے میں آیات قرآنی کے لیے تذکرہ، تبصرہ، ذکریٰ وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن اپنے آپ کو یقینی طور پر "الکتاب" کہتا ہے۔ اس کتاب الٰہی کا ایک صحیفہ ہونا بھی معلوم ہے اور اس کی صفات ہیں "ہدیٰ" اور "فرقان"۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

كلّا انها تذكرة (عبس: ١١) انّ هذه تذكرة فمن شاء اتّخذ الى ربّه سبيلا (الدہر-٢٩) فذكّر ان نفعت الذكرىٰ (الاعلیٰ-٩) ذالك الكتاب لا ريب فيه هدىً للمتقين (البقرہ-٢) شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن هدىً للناس وبيّنٰت من الهدى والفرقان (البقرہ-١٨٥) تبصرةً وّذكرى لكلّ عبد منيب (ق-٨)

عربی مبین

خالص لسانی اعتبار سے قرآن کا دعویٰ "عربی مبین" ہونے کا ہے:

بلسان عربي مبين (الشعراء-۱۹۵) هذا لسان عربي مبين (النحل-۱۰۳)

مبین کا مطلب ہے صاف وصریح، واضح اور واشگاف، جس کے سمجھنے میں کسی زبان داں کو ذرا بھی مشکل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ احکام قرآنی کے فہم میں صحابۂ رسول کو کوئی دشواری نہیں محسوس ہوئی، حالانکہ قرآن کے سبھی بیانات نہایت فصیح و بلیغ ہیں اور عربوں کا حال نزولِ قرآن کے وقت رسمی تعلیم کے لحاظ سے یہ تھا کہ وہ "امی" کہے جاتے تھے، یعنی ناخواندہ، اور ظاہر ہے کہ عہدِ قدیم میں خواندگی کا تناسب دنیا کے ہر خطے میں بہت کم تھا، جب کہ اللہ کا کلام بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے تھا اور ہے، خواہ وہ عالم ہوں یا عامی۔ چناں چہ قرآن کی ہدایات کو سمجھ کر ان پر عمل کرنے کے لیے صرف عربی خواں ہونا ضروری ہے، عالم وفاضل ہونا ضروری نہیں، ہر شخص جو فطرتِ سلیم رکھتا ہے قرآن اس کی اصلی زبان میں پڑھ کر بہ آسانی سمجھ سکتا اور اس پر عمل کرسکتا ہے، جیسا کہ سورۂ قمر کی مندرجہ ذیل آیات سے ظاہر ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ٥ (۱۷، ۲۲، ۳۲) — ہم نے اس قرآن کو نصیحت کا آسان ذریعہ بنادیا ہے۔

ایک کامیاب اور موثر خطبے کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس کے سامعین میں ہر ذہنی سطح کے لوگ بہ قدرِ ذوق اس سے استفادہ کرسکتے ہیں اور خواہ وہ سب ایک بلیغ کلام کے تمام مضمرات کا احاطہ نہ کرسکیں لیکن اس کا ایک عام مفہوم سب کے سب سمجھ لے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن شریف کی سلاست بیان کی انتہا یہ ہے کہ عربی سے دوسری زبانوں میں اس کے جو بے شمار ترجمے ہوتے رہے ہیں ان کے مطالعے سے بھی احکام قرآنی کا فہم بہ آسانی حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے اپنی آیات کو عمومی طور پر "محکمات" قرار دیا ہے جس کا لغوی معنی ہے" واضح باتیں، صاف وصریح ہدایتیں اور استوار وہموار احکام، حالاں کہ آفاقی وابدی آیات قرآنی کے وسیع تر مضمرات کی کوئی حد نہیں ہے، جن کے تجسّس کے لیے تفسیروں کا ایک

طویل سلسلہ جاری ہے۔ یہ ضرور ہے کہ قرآن نے اپنی بعض آیات کو خود ہی "متشابہات" کہا ہے، جن کے معانی پوشیدہ ہیں اور گویا امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں جن پر صرف ایمان لانے اور رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ زندگی کے معاملات میں انسان کے لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں بتائی گئی ہے اور "ام الکتاب" یعنی ہدایت نامہ خداوندی کی اصلی چیز محکمات ہی قرار دی گئی ہیں۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(آل عمران: ۷)

وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے، اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنیٰ پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے کہ ہمارا ان پر ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

دو خصوصیات

انہی حقائق کے پیش نظر قرآن نے اپنی دو خصوصیتوں پر بہت زور دیا ہے:۔

(۱) اول یہ کہ لوگوں کو معجزہ طلب کرنے کے بجائے، جو نظام فطرت کے قوانین میں ایک غیر معمولی خلل اندازی ہے اور مشیت الٰہی اس کا زیادہ استعمال پسند نہیں کرتی،

یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید انسانوں کے ہی مسائل سے بحث کرتا اور حیات و کائنات کے ان سب موضوعات پر روشنی ڈالتا ہے جو عالم انسانیت کے لیے دلچسپی اور فائدے کا باعث ہیں اور یہی قرآن حکیم کا سب سے بڑا اعجاز ہے کہ وہ صحیفۂ واقعات ہے، دیومالاؤں کی طرح خرافات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس بیان حقیقت میں ادب کا یہ تنقیدی نقطۂ نظر بھی مضمر ہے کہ فن لطیف کسی اساطیری گورکھ دھندے کا نام نہیں ہے اور جو فن کا ر رموز و اسرار کو روح جمالیات تصور کرتے ہیں وہ ایک فریب میں مبتلا ہیں اور فنی لطافت کے بارے میں ان کے سارے دعوے محض مغالطے ہیں، اس لیے کہ فن کا حسن زندگی کو ایک معمّہ بنانے میں نہیں، انفس و آفاق کے معموں کو حل کرنے میں ہے۔ تزئین حیات اور توضیح کائنات فن و ادب کا اخلاقی پہلو ہے جس کو نظر انداز کر کے کسی بھی قسم کی نام نہاد جمالیاتی کوشش سراسر لغو و عبث ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (انبیاء: ۱۰)	لوگو ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔
وَقَالُوْا لَوْلَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ (طٰہٰ: ۱۳۳)	وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا۔
اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَةً وَّ ذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۵۱)	اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

(۲) دوم یہ کہ قرآن ایک کتاب حکمت ہے اور اس کا اسلوب بیان بھی حکیمانہ ہے چنانچہ اس کے طرز اظہار کا سب سے نمایاں پہلو تفہیم و تصریح ہے، وہ بالکل سامنے کی ٹھوس حقیقتوں کا حوالہ دے کر اور اپنے اٹھائے ہوئے نکات کا تجزیہ کر کے

انسانی ذہن کو بے خطا اور تیر بہ ہدف دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے، ساتھ ہی لوگوں کے قلب وضمیر پر بھی دستک دیتا ہے۔ یہ بیان صداقت کا وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور جس کو سنناہی، اس کے اوّلین مخالفوں کے بہ قول، اس کے طلسم میں اسیر ہونا ہے۔

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ (نحل: ۱۲۵)	اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔
کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ۝ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ (البقرہ: ۲۱۹)	اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

صحیفۂ انسانیت

ان خصوصیات کی بنا پر قرآن کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے کہ عصر حاضر کا صحیفۂ انسانیت اس کے سوا کوئی اور نہیں، جب کہ ہدایت نامۂ خداوندی کے اعتبار سے پچھلی سب کتب الٰہیہ منسوخ کر دی گئی ہیں اور ان کی بہترین تعلیمات قرآن شریف کے صفحات میں ہی محفوظ کر دی گئی ہیں، حالانکہ پچھلی کتابوں کے ماننے والوں نے ان کی تعلیمات کو مسخ کر ڈالا تھا:

لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ۝ یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثۡبِتُ ۚۖ وَعِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ۝ (الرعد۔ ۳۹-۳۸)	ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے، اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ ام الکتاب اس کے پاس ہے۔

محاورات وامثال

قرآن مجید جیسی کتاب العصر لسانی وسایل سے تو مالامال ہے ہی اور عربی زبان کے محاورات وامثال کی جو نفیس ونادر شکلیں کتاب اللہ میں پائی جاتی ہیں ان کی وجہ سے

زبان عرب کی ثروت دنیا کی دوسری سب زبانوں سے بڑھ گئی ہے۔ یہ محاورات و امثال قرآنی بیانات کے تار و پود ہیں اور کلام الٰہی کی کوئی آیت ان سے خالی نہیں ہے۔ قرآن کی فصاحتِ بیان کے اجزائے ترکیبی میں محاورات و امثال شامل ہیں۔ اِس نکتے کی وضاحت کے لیے صرف چند مثالیں کافی ہوں گی:

۱۔ وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ أَيۡدِيهِمۡ وَرَأَوۡاْ أَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّواْ قَالُواْ لَئِن لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ۝ (اعراف: ۱۴۹)

آیت کا پہلا فقرہ ایک عربی محاورہ ہے اور مثل کی طرح معنی خیز ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا "اور جب چیز ان کے ہاتھوں کی گرادی گئی" لیکن محاورے میں اس کا مفہوم، مولانا مودودیؒ کے ترجمہ قرآن مجید میں، یوں بتایا گیا ہے:

"پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا"

یہ بہت ہی موزوں و موثر مفہوم ہے، اس لیے کہ یہاں طلسم سامری کی کیفیت بیان کی جارہی ہے۔ اس کے لحاظ سے طلسم کا ٹوٹنا اس حالت کے لیے بہترین پیرایۂ اظہار ہے جو بنی اسرائیل کی انکشافِ حقیقت کے بعد ہو گئی تھی اور اس کے بعد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گم راہ ہو گئے تھے اور اگر خدا نے اُن پر رحم کر کے انھیں معاف نہیں کیا ہوتا تو وہ زبردست خسارے میں پڑ جاتے، جیسا پہلے فقرے کے بعد آیت کے باقی حصے کے مطلب سے معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ يَوۡمَ يَرَوۡنَ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةَ لَا بُشۡرَىٰ يَوۡمَئِذٖ لِّلۡمُجۡرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجۡرٗا مَّحۡجُورٗا (الفرقان: ۲۲)

جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن نہ ہوگا۔ چیخ اٹھیں گے کہ پناہ خدا۔

اس آیت کا آخری فقرہ آخرت میں مجرموں کی کیفیت بیان کرتا ہے، جب وہ دنیا میں اپنے لغو مطالبے کے مطابق فرشتوں کو دیکھ لیں گے، مگر یہ وقت ان کے لیے کسی خوشخبری کا نہیں ہوگا۔ یہ آخری فقرے سے قبل کا مفہوم ہے۔ اس حالت میں جب مجرمین چاروں طرف سے گھیر لیے جائیں گے اور ان کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہے گی، جیسا آخری فقرے کے لفظی مطلب سے معلوم ہوتا ہے، تو وہ

"چیخ اٹھیں گے کہ پناہ بخدا" یہ عربی محاورے کا بامحاورہ اردو ترجمہ ہے جو مولانا مودودیؒ نے کیا ہے اور اس سے آخرت میں مجرموں کی پریشان حالی کا پورا اظہار ہو جاتا ہے۔

۳۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝ (الرعد: ۱۷)

آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ "جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے"۔ یہ دراصل مذکورہ آیت کے آخری حصے کا ترجمہ ہے، جب کہ پوری آیت میں حق وباطل کا فرق بتانے کے لیے قرآن حکیم نے نزول بارش کی مثال دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ پانی برساتا ہے تو ندی نالے اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلتے ہیں، پانی کی اس رو میں جھاگ بھی اٹھتے ہیں، جس طرح زیور اور برتن بنانے کے لیے پگھلائی ہوئی دھاتوں میں بھی ہوتا ہے، مگر جیسا کہ محولہ حصۂ آیت سے واضح ہوتا ہے جھاگ باطل کی طرح اڑ جاتا ہے، جب کہ حق اصل چیز کی طرح باقی رہ جاتا اور انسان کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ بہترین مثال ہے جو حق وباطل کے درمیان امتیاز کے لیے کسی بھی زبان میں دی جا سکتی ہے اور قرآن نے اس مثل کو اختیار کر کے اس کے مضمرات کی پوری صراحت بھی خود ہی کر دی ہے۔ زیر بحث نکتے کو سمجھانے کے لیے اس سے زیادہ دل نشیں اور پرتاثیر پیرایہ ممکن نہیں ہے۔

تشبیہات واستعارات

محاورات وامثال کے علاوہ قرآن نے تشبیہات واستعارات کا استعمال بھی بہ کثرت کیا ہے۔ ان میں ہر ایک تشبیہہ واستعارہ اپنی جگہ موزوں ترین اور موثر ترین ہے، جس سے مقصد بیان میں زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ساتھ نفاست بھی پیدا ہوتی ہے، یعنی قرآن کے استعمال کیے ہوئے نقوش (figures of speech) محض خوب صورتی اور زینت کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ان سے معانی کی صراحت اور مضمرات میں وسعت پیدا ہوتی ہے، اس طرح ان کی حیثیت تجمل سے زیادہ توضیحی اور تزئین سے بڑھ کر تشریحی ہو جاتی ہے۔ قرآنی اسلوب میں لطفِ بیان تبیینِ الکلام سے الگ کوئی چیز نہیں۔

یہ ایک ایسی نثر کا طرزِ اظہار ہے جو اپنی ہیئت میں نظم نہیں ہوتے ہوئے بھی شعریت کی تمام خوبیوں سے معمور ہے۔ ذیل میں اس حسین، پراثر اور فکر انگیز نثر کی چند مثالیں دی جاتی ہیں:

۱۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی کَالَّذِیْ
یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ
کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا ؕ لَا
یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ۝
وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَهَا
ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

(البقرہ ۲: ۲۶۴-۶۵)

یہ تشبیہ صدقات میں ریا اور خلوص کا فرق بتانے کے لیے پیش کی گئی ہے۔ قرآن نے دو مثالیں دی ہیں، ایک ایسی چٹان کی جس پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہو مگر جب زور کی بارش ہو تو وہ دھل جائے اور چٹان صاف کی صاف رہ جائے، دوسری ایک زرخیز اونچی زمین کی ہے جس پر زور کی بارش پڑے تو اس میں دوگنی پیداوار ہو اور اگر پھوار بھی اس پر پڑ جائے تو اس کے بارور ہونے کے لیے کافی ہو۔ پہلی مثال اس خیرات کی ہے جو دکھاوے کے لیے کی جاتی ہے، اس کے ذریعے احسان جتایا جاتا ہے اور اس طرح خیرات لینے والے کو تکلیف دی جاتی ہے، جب کہ دوسری مثال اس خیرات کی ہے جو دل جمعی کے ساتھ صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے دی جاتی ہے۔ پہلی قسم کا عمل بے برکت، ناشائستہ اور بے فائدہ ہے، دوسری قسم کا عمل مبارک، مہذب اور مفید ہے۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لیے خیرات کے مظاہرے کو خالی چٹان سے تشبیہ دی گئی، جس پر ہزار مینھ برسے وہ خالی ہی رہے گی، بالکل بے برگ و ثمر، جب کہ پرخلوص خیرات کو اونچی زمین کے ایک باغ سے تشبیہ دی گئی جس پر ہلکی سے ہلکی پھوار بھی اسے بارور کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس طرح دکھاوے کی نیکی رائیگاں جاتی ہے اور دل سے کی ہوئی بھلائی برگ و بار لاتی ہے۔ اس ایک نکتے کی صراحت کے لیے جو تشبیہ استعمال کی گئی ہے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ اخلاص

عمل کو پرکشش بناتی ہے اور بدنیتی کو بدنما۔ اس انداز سے صرف خلوص و عدم خلوص کا فرق نہیں معلوم ہوتا ہے، بلکہ خلوص میں دل آویزی پیدا ہوجاتی ہے اور عدم خلوص سخت مکروہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی قرآن کا مقصد ہے، وہ نیکی کو اس کی پوری خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور بدی کو اس کی پوری بدصورتی کے ساتھ۔ یہ طرز ابلاغ نہایت بلیغ ہے اور اس سے تبلیغ کا حق ادبیت کی پوری شان کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔

۲۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (الحج: ۳۱)	جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

یہ تصویر ہے شرک کرنے والے کی جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ آسمان سے گر پڑا ہے اور عناصر کے رحم و کرم پر ہے، چاہے اسے ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے اچک لے جائیں یا آندھیاں بہت دور لے جا کر ایسی پستی میں پھینک دیں کہ اس کے چیتھڑے اڑ جائیں۔ یہ استعارہ ہے مشرک کی بے بسی کا اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک خدا کو مان کر انسان بلندیوں پر متمکن رہتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ شرک میں مبتلا ہوتا ہے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں رہ جاتا، ایک خدا کا سہارا جو چھوٹتا ہے تو پھر کوئی سہارا باقی نہیں رہتا، وہ بالکل ہواؤں کی زد پر آجاتا ہے، کوئی بھی شکاری اسے شکار کر سکتا ہے اور ہر حال میں اسے بلندی سے گر کر چکنا چور ہونا ہے۔ اس سے زیادہ بھیانک تصویر ایک مشرک کے حال زار کی نہیں ہو سکتی۔ آسمان سے گرنے والے کا تصور کیا جائے تو شرک کی ساری ہولناکی اور تباہ کاری آشکار ہو جاتی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ توحید سے بڑھ کر رفعت و طمانیت کا کوئی تصور انسان کے لیے نہیں ہو سکتا۔ یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ وسیع و عریض کائنات میں انسانی وجود کے لیے واحد جائے پناہ اور جائے قرار وحدتِ الٰہ پر ایمان ہے، جب کہ اس وحدت سے انکار کر کے انسان بے بسی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی بے پناہی اسے بازیچۂ عناصر بنا دیتی ہے، توحید سے انسان کو وقار و استقلال نصیب ہوتا

ہے اور شرک کے سبب وہ خفّت اور تنزلزل کا شکار ہو جاتا ہے۔

۳۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (الانشقاق: ۱۹-۱۶)	پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔

آخری آیت انسان کے احوال کی تبدیلی و ترقی پر دلالت کرتی ہے۔ اس خیال کی تصریح کے لیے قبل کی تین آیتوں میں تبدیلی و ترقی کے تین قدرتی پیکر تسلسل کے ساتھ استعمال کیے گئے۔ ایک شفق، دوسرے رات، تیسرے چاند۔ ان تینوں پیکروں میں تدریجی تغیر اور کمال کے اشارات موجود ہیں، شفق افق پر آہستہ آہستہ پھول کر پھیل جاتی ہے، رات دھندلکے سے شروع ہو کر گھپ اندھیرے تک پہنچتی ہے، چاند ہلال کی شکل میں نمودار ہو کر بڑھتے بڑھتے بدرِ کامل بن جاتا ہے یہ گویا کائنات میں عناصر کی ہستی کا نظام ہے اور انسان اسی نظام کے اندر سانس لے رہا ہے، لہٰذا اسے جاننا چاہیئے کہ مظاہرِ حیات کا قانونِ قدرت کیا ہے؟ یہ ایک پیہم ارتقا کا اصول ہے جس پر دنیا قایم ہے۔ لہٰذا اس تغیر پذیر دنیا میں انسان کو متحرک، فعال اور سرگرمِ کار رہنا چاہیے۔ تاکہ کائنات کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے ارتقا کا سامان بھی قواعدِ فطرت کے مطابق ہو۔ اس مفہوم کے ابلاغ کے لیے جو استعارات استعمال کیے گئے ہیں وہ علامات کی حد تک لطیف اور معنی آفریں ہیں۔ یہ اشاریت آیات کے مقصود کو مبہم نہیں، زیادہ سے زیادہ واضح کرتی ہے۔ یہ ایک محکم اندازِ بیان ہے جس میں کائنات کے نمایاں حقایق سے استشہاد کیا گیا ہے اور بالکل سامنے کی باتوں سے ایک بڑی بات، ایک آفاقی صداقت پر تاکیدی نشان لگایا گیا ہے۔

اب غور کرنا چاہیے کہ تشبیہ و استعارہ کی تینوں مثالوں میں قرآن نے فطرت کے ان مظاہر سے کام لیا ہے جنھیں ہر آدمی کھلی آنکھوں دیکھتا اور بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس طریقِ کار سے اول تو بیان میں تازگی اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے، دوسرے

مفہوم زیادہ سے زیادہ دل نشیں اور واضح ہوجاتا ہے۔ یہ ایک بامقصد تحریر یا تقریر کا کمال ہے۔ اس میں تبلیغ تزئین اور تصریح کے عناصر جمع ہوکر اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ایک بہترین اسلوب ہے جس کا نمونہ وحی الٰہی نے پیش کیا ہے یہی معیارِ اظہار و بیان ہے۔

کثیر المعانی

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے، جس میں بداعت کے سارے انداز ایک ایسے نظم وضبط پر مبنی ہیں جو کامل فصاحت و سلاست کا ضامن ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر ذومعنی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، مگر جو معنی بھی لیا جائے وہ اپنی جگہ واضح ہے اور اگر سب معانی بھی لے لیے جائیں تو کوئی ابہام نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بات دو مثالوں سے صاف ہوسکتی ہے۔

(۱) قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (الشوریٰ: ۲۳)	اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔
(۲) اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ○ (الشوریٰ: ۴۷)	مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔

پہلی آیت میں رسول اللہ کو یہ اعلان کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی نصیحتوں کے لیے لوگوں سے کوئی اجر نہیں طلب کرتے، صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگ قرابتداری کا لحاظ کریں۔ یہاں قرابت داری "قربیٰ" کا ایک ترجمہ ہے، جب کہ اس کا دوسرا ترجمہ ہے اللہ کی قربت۔ بعض لوگ ایک تیسرا ترجمہ رسول کے "اقربا کی محبت" بھی کرتے ہیں۔ ہر حال میں اللہ کا قرب مقصود ہے یا انسان کی قربت و قرابت۔ یہ

ایک اعلیٰ مقصود ہے اور اس کا اظہار صریحاً ہوتا ہے، خواہ اس کے مضمرات کتنے ہی وسیع ہوں۔ صراحت وجذالت کا یہ امتزاج کلام اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

دوسری آیت میں چار مطالب کی گنجائش ہے، جس کا تعلق لفظ "نکیر" کے ترجمے سے ہے۔ آیت لوگوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ قیامت سے پہلے، جس کا وقت کسی کو معلوم نہیں اور ہر آدمی کی موت ہی اس کی قیامت ہے، فرمانِ الٰہی کو تسلیم کرلیں، ورنہ جب قیامت آجائے گی تو اس سے نہ کسی کو پناہ ملے گی نہ کوئی اس وقت اپنے کسی قابلِ مواخذہ فعل سے انکار کرسکے گا، نہ اس فعل کے عذاب سے بچنے کے لیے کہیں بھیس بدل کر چھپ سکے گا، نہ اپنے اعمال کے حساب وکتاب اور جزا وسزا پر وہ کوئی احتجاج کرسکے گا، اور نہ اپنی حالت کو بدل سکے گا۔ آخر کے چاروں مطالب ایک لفظ کے ہیں اور ان میں کوئی ایک مطلب بھی آیت میں مذکور ہدایت کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے، جب کہ سب مطالب مل کر اہمیت میں بے پناہ اضافہ کردیتے ہیں۔

انتخاب الفاظ

واقعہ یہ ہے کہ مختلف معانی اور ان کے مواقع کے لیے موزوں ترین الفاظ کا انتخاب قرآن کے ادبی کمالات میں سرفہرست ہے۔ لفظیات قرآنی پر ایک نظر ڈالنے سے زبان وبیان کے جادو کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ لفظوں کی قوت کس طرح آفاقِ ہستی اور نفسِ انسانی کے سارے خم وپیچ کھول کر رکھ دیتی ہے۔ قرآن نے قلم کی طاقت کی قسم بلاوجہ نہیں کھائی ہے اور قرأت کے حکم سے وحی کا آغاز بالوجہ کیا ہے۔ خود لفظ قرآن کا مفہوم پڑھنا پڑھانا ہے۔ اس لیے نطق کو انسانیت کا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا ہے اور تعلیم اسماء کو فرشتوں پر انسان کی فضیلت کا باعث۔ حسب ذیل آیت مختلف مدارج حیات اور مظاہر زندگی کا اظہار منتخب الفاظ کے ایک طلسم سے کرتی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن
تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ

مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ (الحج: ۵)

"لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس مینھ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔

یہ قرآن کے عربی الفاظ کا وہ بہترین اردو ترجمہ ہے جو مولانا مودودیؒ نے کیا ہے اور اس سے کلام اللہ کی فصاحت و بلاغت کا جس حد تک ترجمے میں ممکن ہے اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس بیان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عاقبت کے امکان کی منطقی توجیہہ حیاتِ دنیوی اور مناظرِ قدرت کے نشیب و فراز اور آغاز و انتہا کی بالکل حقیقت پسندانہ تصویر کشی سے کی گئی ہے اور اس تصویر کا ہر رنگ ایک چنے ہوئے لفظ سے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہاں منتخب الفاظ ہی وہ پیکر تراشتے ہیں جو مفاہیم کی نقاشی کرتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک پردۂ سیمیں پر اپنا جلوہ دکھا رہی ہے، یعنی الفاظ ٹھوس شکلوں کے نقوش مرتب کرتے ہیں اور خیال کی تجسیم اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے ہر جز میں ایک عضو کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

آہنگ نغمہ

اسلوب کے اس رنگ کی برّاقی کو جو چیز سحر کی حد تک بڑھا دیتی ہے وہ اس کا آہنگ ہے، یعنی نقوش کی شوخی نغمات کی شیرینی سے مل کر ایک طلسم قائم کرتی ہے۔ مکّی سورتوں میں تو یہ کیفیت بہت نمایاں ہے، مگر دوسری سورتیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ دراصل یہ کوئی قافیہ پیمائی یا زمزمہ پردازی نہیں ہے، صرف الفاظ کی چست نشست وبرخاست کی معنی آفرینی ہے، جس کی نغمگی بالکل فطری اور بلا تکلّف ہے۔ یہ روانیٔ بیان کا کمال ہے کہ الفاظ و فقرات مترنّم نظر آتے ہیں۔ اس طرزِ نگارش کے لیے سب سے مشہور سورۂ رحمان ہے جس میں بڑے پیمانے پر لفظوں کی نغماتی قماش ایک تسلسل کے ساتھ ابھرتی اور شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں سورۂ واقعہ کا مطالعہ ادبی لحاظ سے زیادہ نتیجہ خیز ہوگا، اس لیے کہ اس میں قوافی کا وفور تنقیدی حسّ کو کند نہیں کرتا اور ایک باذوق قاری پوری بصیرت کے ساتھ بیان واقعات اور اظہار حقایق کے اسلوبیاتی پیچ وخم کا تجزیہ کرسکتا ہے۔ اس کیفیت کا جائزہ لینے کے لیے ذیل میں سورۂ النجم کی صرف چند آیتیں ایک خاص مقام سے پیش کی جاتی ہیں:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ عِنْدَ	ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدرۃُ المُنتہیٰ
سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ	کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی
الْمَاْوٰى ○ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ	جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ
مَا يَغْشٰى ○ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا	پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ
طَغٰى ○ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ	چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور
الْكُبْرٰى ○	اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں
(۱۸-۱۳)	دیکھیں۔

یہ معراج النبی کے عظیم الشان واقعے کے دوسرے اور آخری مرحلے کا ذکر ہے جب حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے سیاحت علوی پر گئے اور خلا میں پرواز کرتے ہوئے تمام ستاروں اور سیاروں سے گذر کر کائنات کی آخری سرحد تک پہنچ گئے۔ اس کے باوجود کہ ایک طرح کا قافیہ چھ آیتوں کے آخری الفاظ

میں نظر آتا ہے، یہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی لفظ قافیے کے لیے لایا گیا ہے، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ چند معانی کے اظہار کے لیے چند مناسب ترین الفاظ قرینے اور سلیقے سے ایک ترتیب کے ساتھ یکے بعد دیگرے اپنی خاص جگہوں پر رکھے گئے ہیں۔ لیکن ایک لطیف نغگی کا تاثر بہر حال ہوتا ہے اور اگر چھوٹی چھوٹی آیتوں کے لفظ "ی" پر الف ممدودہ کے ساتھ ختم ہونے پر غور کیا جائے تو انکشاف ہوگا کہ یہ آہنگ فی الواقع معراج کی سواری، براق اور رفرف، کی برق رفتاری اور عالم بالا کے مشاہدات کی جلوہ سامانی دونوں کا غماز ہے۔ یہ ادبیت کا وہ نقطۂ عروج ہے جس کے آگے جانے کا سوال تو دور کی بات ہے، اس کی حد تک پہنچنا بھی دشوار ہے۔ یہاں بیان و بدیع کی ساری حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور نطق انسانی پر ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔

تمثیل

ترنم کے ساتھ ساتھ تمثیل کی صورت بھی قرآن میں بہ کثرت رونما ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیتوں میں مرقع بھی ہے، مکالمہ بھی:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ (انعام: ۳۰)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ (انعام: ۹۳)

پہلی آیت میدان حشر کا منظر پیش کرتی ہے، جب آخرت کا انکار کرنے والے خدا کے حضور کھڑے کیے جائیں گے اور وہ ان سے پوچھے گا "کیا یہ سچ نہیں ہے؟" وہ جواب دیں گے "ہاں، اے ہمارے پروردگار! یہ حقیقت ہے"۔ تب خدا کا ارشاد ہوگا "اچھا، تو اپنے انکار حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو"۔ دوسری آیت انہی ظالموں کی موت کا منظر پیش کرتی ہے، جب فرشتے ہاتھ پھیلا کر سختی سے کہیں گے "لاؤ، نکالو اپنی جان" حالاں کہ اس وقت گناہ گار سکرات موت میں غوطے لگا رہے ہوں گے۔ دونوں مناظر ہول ناک ہیں اور مکالمہ ان کی دہشت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح موت اور قیامت دونوں کا لرزہ خیز تاثر چند سادہ سے الفاظ کی ترتیب سے قائم ہوتا ہے اور اپنے

اندر عبرت کے ہزار سامان رکھتا ہے، جس کا جی چاہے مہلت عمر ختم ہونے سے پہلے توبہ کرکے اصلاح احوال کرلے۔

ظرافت

کلامِ الٰہی میں طنز و مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے، جس کا مقصد انسان کی دکھتی رگوں کو چھیڑ کر اسے خبردار کرنا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ
الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (آل عمران: ۲۱)

یہ چوٹ بنی اسرائیل پر ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہوئے اپنے پیغمبروں اور عدل و انصاف قائم کرنے والے انسانوں کو ناحق قتل کرتے ہیں، لہٰذا "انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو"۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ إِنَّا
أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا (الکہف: ۱۰۲)

جو کفار اللہ کے بندوں کو اللہ کے سوا اپنا کارساز بنا لیتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ "ہم نے ایسے کافروں کی ضیافت کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے"۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ
فِيهَا (التوبہ: ۶۸)

تمام منافق مردوں، عورتوں اور کافروں سے اللہ یہ "وعدہ" کر رہا ہے کہ وہ سب کے سب ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

نکتہ سنجی

درحقیقت خوش طبعی کے نکتہ سنجی آیات قرآنی کا نمک ہے:

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ۝
وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ۝

(ہود: ۹۸ - ۹۹)

فرعون کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ قیامت کے روز اپنی قوم کی رہنمائی جہنم کی طرف کرے گا، جو کسی کے "فروکش ہونے کی بدترین جگہ" ہے، اوران لوگوں پر دنیا و آخرت دونوں جگہ خدا کی لعنت پڑی ہے، جو کسی کو ملنے والا "بدترین صلہ" ہے۔

ایجاز

ان نکتہ سنجیوں میں ایک طرف تو ایجاز کی بلاغت ہوتی ہے اور دوسری طرف نکات و مضمرات کی تفصیل و تکمیل۔ قرآن بعض اوقات بہت اختصار کے ساتھ صرف اشارے کر دیتا ہے جو مناسب موقع اور مفیدِ مطلب ہوتے ہیں اور بعض اوقات کسی بات کے ہر پہلو کا الگ الگ ذکر کرکے دربیش معاملے کے تمام حقائق کا تجزیہ کر دیتا ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال-١٧)

یہ بدر کی جنگ کے موقعے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کفار کی طرف مٹھی بھر ریت پھینکنے کا تذکرہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ وہ ریت دراصل خدا کی طرف سے پھینکی گئی۔ بہ قول مولانا مودودیؒ "مطلب یہ ہے کہ ہاتھ تو رسول کا تھا مگر ضرب اللہ کی طرف سے تھی" یہ چند لفظوں میں ایک بلیغ اشارہ ہے مشیت و قدرت الٰہی کی طرف۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ: ١٨٧)

رمضان میں رات کے وقت کھانے پینے کے ساتھ مباشرت کی اجازت دیتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ عورت مرد کا لباس ہے اور مرد عورت کا لباس۔ یہاں ایک لفظ "لباس" مرد و عورت کے تعلق کی فطری ضرورت و اہمیت اور ان کے باہمی تعاون، لازمی رفاقت اور قدرتی محبت کو آشکار کرتا ہے۔

تفصیل

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ	اے نبی! کہہ دو اگر تمہارے باپ
وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَ	اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی

عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ ○

(التوبہ - ۲۴)

اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

یہاں راہِ خدا میں جہاد سے جی چرانے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ان کے دلوں کے ہر چور کو پکڑ لیا گیا ہے، خواہ وہ قریب ترین رشتہ داروں کی قرابت کا لحاظ ہو، یا دولت کا لالچ ہو، یا کاروبار میں خسارے کا خوف ہو، یا عشرت کدوں کی محبت ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○

(یونس: ۳۵)

ان سے پوچھو تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے فیصلے کرتے ہو؟" (ترجمہ قرآن مجید از مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

ان جملوں میں خدا کی اطاعت کو مبنی برحق ثابت کرنے کے لیے ہدایت کو خدا کے ساتھ مختص اور اس کی حاکمیت کی سب سے بڑی دلیل ثابت کیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے تشریح کے ساتھ دوسروں کی طرف ہدایت کی نفی کی گئی ہے۔

استدلالی اسلوب

یہ ایک منطقی و استدلالی اسلوب بیان ہے جس کا مطمح نظر افہام وتفہیم ہے۔ قرآن انسانی دماغ کو اپیل کرکے لوگوں کو حقیقتوں کا قائل کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ تدبّر وتفکر کی دعوت دیتا ہے اور انفس وآفاق کی بصیرت حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَاؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَؕ قُلِ الْعَفْوَؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۝ (البقرہ: ۲۱۹)	لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، انھیں بتاؤ کہ ان چیزوں میں بڑی خرابی ہے، اگرچہ کچھ منافع بھی ہیں، لیکن خرابی نفع سے بہت زیادہ ہے۔ لوگ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں، کہو، جو کچھ تمہاری ضرورت سے بچ رہے۔ اللہ اسی طرح تمہارے لیے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر سے کام لو۔

اس بیان میں شراب اور جوئے کی حرمت کو نفع ونقصان کے پیمانے پر پیش کیا گیا ہے اور ضرورت سے زاید مال کو فلاحی کاموں میں خرچ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے تفکر وتدبّر کی دعوت دی گئی ہے۔

اقدامی وحرکی انداز

بہرحال، قرآن کوئی تصنیف نہیں، ایک خطبہ ہے اور عقل کے ساتھ ساتھ دلوں کو چھوتا ہے، تاکہ بات نفس انسانی کی گہرائیوں تک پہنچ جائے اور لوگ قایل ہونے کے

بعد میدان عمل میں بھی قدم اٹھائیں اور بڑھائیں۔ قرآن کا انداز اقدامی اور حرکی ہے۔ اسی لیے اس کتاب میں لوگوں سے خطاب کے اسالیب میں تنوع بھی ہے اور بعض دلایل کی تکرار بھی۔ اس طرح بیان میں دل چسپی پیدا ہوتی ہے اور باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں:

وَمَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَیِّضۡ لَہٗ شَیۡطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیۡنٌ ۝ وَ اِنَّہُمۡ لَیَصُدُّوۡنَہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ۝ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیۡتَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَیۡنِ فَبِئۡسَ الۡقَرِیۡنُ ۝ وَ لَنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡیَوۡمَ اِذۡ ظَّلَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ ۝ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ اَوۡ تَہۡدِی الۡعُمۡیَ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۝ (الزخرف: ۴۰-۳۶)	جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا "کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا، تو تو بدترین ساتھی نکلا۔ اس وقت ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں۔ اب کیا اے نبی، تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گم راہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے"؟ (ترجمہ مودودی)

اس بیان میں سب سے پہلے صیغہ واحد غائب میں ایک عام بات کہی گئی، اس کے بعد صیغہ جمع غائب میں گویا اس عام بات کا اعلان کچھ خاص قسم کے لوگوں پر کیا گیا، پھر ان میں ہر ایک کے لیے واحد غائب کا صیغہ اختیار کر کے ان سب سے صیغہ جمع حاضر میں خطاب کیا گیا، آخر میں رسول سے واحد حاضر میں کلام کیا گیا۔ یہ طریق اظہار

ایک ایسے خطیب کا ہی ہوسکتا ہے جس کا تخاطب بہ یک وقت سامعین کے مختلف حلقوں سے ہو اور سیاق عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدائے ذوالجلال کے سامنے متعدد فریق کھڑے ہوئے ہیں اور وہ ان میں ہر ایک کے بارے میں مناسب موقع بیان دے رہا ہے، یہاں تک کہ بیانیہ میں مکالمہ کے انداز بھی شامل ہیں۔ اس صورت ابلاغ سے ایک پرلطف منظر ابھرتا ہے، جو حد درجہ عبرت خیز اور فکر انگیز ہے۔

ولقد صرفنا فی هٰذا القراٰن	ہم نے اس قرآن میں طرح طرح
لیذکروا (بنی اسرائیل۔۴۱)	سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں۔

قرآن حکیم میں بار بار لوگوں کو اپنے وجود، کائنات اور تاریخ میں پھیلے ہوئے آثار و شواہد کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ایمان و عمل، توحید و رسالت و آخرت، جزاو سزا اور جنت و جہنم کے بیانات بھی بہ کثرت قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ اس تصریف آیات کا مقصد تذکیر ہے، انسانوں کو خبردار کرنا ہے، ان پر حجت تمام کرنا ہے، بار بار آفاقی صداقتوں اور بنیادی حقیقتوں کو ان کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے، تاکہ وہ اچھی طرح سوچ بچار کر اپنی اصلاح و فلاح کا سامان کریں۔ اس طریق تخاطب میں خردمندی بھی ہے، دردمندی بھی:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ	اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل:۱۲۵)	کو دانش مندی اور خیر خواہی سے بلاؤ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے رسول کے کار رسالت کی تصریح اس طرح کرتا ہے:

لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً مّن انفسھم
یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة
وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آل عمران۔۱۶۴)

لٹریچر: آرٹ اور سائنس

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ کے چار کام ہیں جن کے لیے ان کی بعثت ہوئی۔

۱۔ آیات الٰہی کی تلاوت ۲۔ تزکیہ نفوس۔ ۳۔ تعلیم کتاب۔ ۴۔ تعلیم حکمت

ان باتوں کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم ایک لٹریچر ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی حکیمانہ اصلاح و ترقی مطلوب ہے۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں نے کتاب کا مفہوم آرٹ لیا ہے اور حکمت کا سائنس۔ دونوں صورتوں میں لٹریچر کا نکتہ واضح ہے۔ لیکن آیاتِ قرآنی کے درمیان آرٹ اور سائنس کا امتیاز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ جیسا سورۂ نحل کی محولہ بالا آیت سے معلوم ہوا تبلیغ حق ہر شکل میں ایک حکیمانہ اسلوب سے ہی کرنی ہے، جب کہ کلام الٰہی میں جملہ علوم و فنون کے آخری مسائل کے حل کے اشارات موجود ہیں جن سے آرٹس اور سائنس دونوں کے ماہرین استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ سب اشارات ایک فصیح و بلیغ زبان میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن مجید میں بصیرت اور ادبیت کا کامل امتزاج پایا جاتا ہے۔ قرآنی لٹریچر میں اخلاقیات اور جمالیات کی مکمل ہم آہنگی ہے۔ اس لیے کتاب اللہ وسیع ترین علم اور بہترین عمل کا دستاویزی صحیفہ ہے۔ حسب ذیل مقولات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ نکات واضح ہو جائیں گے:

(۱) يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (الزمر: ۶)
وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔

(۲) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (الشوریٰ- ۲۹)
اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جان دار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں

(۳) وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۴۰)
یہ زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔

(۴) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (بنی اسرائیل- ۱۵)
کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

(۵) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (الانبیاء- ۳۵)
ہر جان دار کو موت کا مزا چکھنا ہے۔

(۶) اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود- ۱۱۴)
درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

(۷) وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات ۴۹)
اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔

(۸) أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝ (الانبیاء: ۳۰)

کیا وہ لوگ جنھوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟

آیات نمبر ۱، ۲، ۷، ۸ کا تعلق اس چیز سے بتایا جا سکتا ہے جسے سائنس کہا جاتا ہے، اس لیے کہ پہلی آیت میں بچے کی پیدائش کے مختلف مراحل کا ذکر ہے جن کے علم کا اصطلاحی نام جدید طب میں Gynaecology ہے، دوسری آیت تخلیق کائنات کا نقشہ پیش کرتی ہے جس سے بحث Cosmology میں کی جاتی ہے۔ دونوں آیتوں میں بعض ایسے حقائق کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا انکشاف سائنس کی تازہ ترین ترقیات سے ہی انسانی ذہن کے لیے ممکن ہوا ہے، بچے کا ماں کے پیٹ کے اندر تین تہوں میں محفوظ ہونا دور قدیم میں کسی کو معلوم نہیں تھا اور اب بہت تجربات کے بعد لوگوں کو اس کی واقفیت ہوئی ہے۔ زمین کے ساتھ ساتھ آسمانوں میں بھی جان دار مخلوق کی موجودگی کا سراغ عصر حاضر کی خلا پیمائی اور سیاحت علوی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور سائنس داں اس مفروضے پر کام کر رہے ہیں کہ ہر سیارے میں جان دار مخلوقات وہاں کی فضا کے مطابق پائی جاتی ہیں، جب کہ قرآن نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی انسان کو یہ بات وحی کے ذریعہ بتا دی۔ ساتویں آیت میں ہر چیز کے جوڑے کا نکتہ علم الحیات Biology کی ایک حقیقت ہے، جب کہ آٹھویں آیت علم الکائنات کے دو اہم ترین واقعات پر دلالت کرتی ہے، ایک زمین و آسمان کا شروع میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہونا اور بعد میں ان کا ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو جانا جس طرح چنا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، دوسرے پانی کا ابتدائی و بنیادی مادۂ حیات ہونا۔ یہ دونوں باتیں جدید سائنس کے قیاسات ہیں اور قرآن کے مطابق واقعات۔ چاروں آیات میں حکمت کے نکات مختصر، سادہ، معنی خیز اور فکر انگیز الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں جن پر غور کر کے بڑے بڑے پیچیدہ سے پیچیدہ فارمولے مرتب جا سکتے ہیں۔ یہ قرآنی اسلوب سائنس کا ایک صاف، سلیس اور پر معنی لٹریچر تصنیف کرتا ہے۔

آیت نمبر ۳ ایک تاریخی مظہر کا اعلان کرتی ہے جو تاریخ کے تمام مباحث کا نچوڑ ہے۔ اس لیے کہ گردش ایام کے نشیب و فراز سے ہر قوم اور ہر فرد کو ہر زمانے میں گزرنا پڑتا ہے۔ چوتھی آیت اخلاقیات کا یہ سبق دیتی ہے کہ ہر فرد کو اپنی ذمے داری خود ہی ادا کرنی ہے، یہ اعمال کی جواب دہی کا حقیقی تصور ہے۔ پانچویں آیت موت کی آفاقی صداقت کا تخلیقی اظہار ہے، چھٹی آیت قانون مکافات میں شر کے مقابلے پر خیر کی برتری کا حوصلہ افزا بیان ہے۔ یہ سب باتیں نہایت بلیغ انداز سے اور بہت ہی واضح طور پر کہی گئی ہیں۔ یہ گویا آرٹس کا قرآنی لٹریچر ہے۔ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ ہر قسم کے علوم و فنون کے نکات قرآن حکیم دقیقہ سنجی کے ساتھ لیکن پوری صراحت سے پیش کرتا ہے، حقائق خواہ کتنے ہی گہرے اور وسیع ہوں، قرآن کے الفاظ و فقرات بالکل سلیس، شستہ، برجستہ اور رواں ہیں۔

خطبے کی ادبیت

یہ ہے قرآن مجید کی ادبی خطابت (Literary rhetoric) کا اعجاز، جس میں ایک خطیبانہ کلام کے تمام دل کش پیچ و خم کے ساتھ ادب کے تخلیقی اظہار کے جملہ محاسن ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اس ہم آہنگی میں مواقع اور واقعات کے لحاظ سے اسالیب کا تنوع کوئی خلل نہیں ڈالتا بلکہ اضافہ کرتا ہے، اس لیے کہ تنوع سے نغمۂ الفاظ کی قماش وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے اور طرز بیان کی ثروت و دبازت بڑھتی جاتی ہے۔

اس دفور میں تصاویر کی رنگا رنگی کا بھی وافر حصہ ہے۔ محاورات، تشبیہات، امثال، استعارات، تلمیحات، علامات کا ایک پورا نظام ہے جو قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں میں اوّل سے آخر تک پایا جاتا ہے۔ کائنات و حیات اور ادوار و تواریخ کے سارے اشارات قرآنی الفاظ و تراکیب میں سموئے ہوئے ہیں۔ مواد کی یہ فراوانی ایک ایسی تخلیقی ہیئت میں بروئے اظہار آئی ہے جس کا سانچہ پیہم پھیلتا جاتا ہے، مگر ٹوٹتا کبھی نہیں۔ قرآن کی عبارت نہ تو شاعری ہے، نہ نثری نظم، نہ ڈرامہ نہ افسانہ، نہ انشائیہ، یہ ابتدا سے انتہا تک ایک خطبہ ہے، جس میں شاعری، ڈراما، افسانہ اور انشائیہ کے عناصر ادبی اظہار کی ایک ایک خاص ترکیب سے شیر و شکر ہو کر ایک مخصوص وسیلۂ ابلاغ ترتیب دیتے ہیں۔

یہ وسیلۂ ابلاغ عربی ادب کی ایک صنف، خطبہ، کو فروغ دے کر ادبیت کے

سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت شاعری اور خطبے کے دو وسائلِ ابلاغ عربی زبان میں سب سے نمایاں تھے اور عربوں کی طلاقتِ لسانی کا اظہار بالعموم انہی دونوں اصناف میں ہوتا تھا۔ ان کے فصیح البیان افراد اپنی قوتِ گویائی کا سکہ انہی کے ذریعہ چلاتے تھے اور سبعہ معلقہ نے شاعری کو ایک مقدس مرتبہ عطا کر دیا تھا، مگر قرآن نے خطبے کا انداز اختیار کر کے اس کی سرحدیں الوہیت تک بڑھا دیں۔ اب عربی زبان سخنوری سے ترقی پا کر کلام ربانی کا ذریعۂ اظہار بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کا بلند ترین معیار ہمیشہ کے لیے معین ہو گیا اور وہ ادب کے اس نقطۂ عروج تک پہنچ گئی جو اسلوب بیان کے ارتقا کا آخری مرحلہ ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے عربی ادب میں قدیم و جدید کی لسانی تمیز مشکل ہے۔ کلام الٰہی کی خطابت ایک ایسی نثر میں ہے جو نظم کی خوبیاں بھی رکھتی ہے اور اس کے قواعد و ضوابط کی بندشوں میں اسیر بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ بندے سے خدا کا خطاب انسانی اصناف ادب کا پابند نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس خطاب کی ادبیت کا اندازہ لگانے کے لیے عام تنقیدی تصورات میں وسعت پیدا کرنی ہوگی۔

اس وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قرآن میں منظر نگاری، مکالمہ نویسی، شعریت افسانویت، انشا پردازی، کردار نگاری، علمی تحقیق، تاریخی تفتیش، نفسیاتی تحلیل معاشی تجزیہ، تمثیل و ترنم، تفکر اور تحریک سبھی کے انداز ایک خاص نفاست، سلاست اور بشاشت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ادبی نقوش کا یہ مرکب ایک عطر مجموعہ ہے جس کی خوشبو سے ذہن و قلب کی تمام جہتیں بہ یک وقت متاثر ہوتی ہیں۔ اس لیے مطالعۂ قرآن کے اثرات انسان کے پورے وجود پر محیط ہو جاتے ہیں اور آیات قرآنی کے رنگ و آہنگ سے آدمی کے رگ و پے میں بجلیاں سی دوڑنے لگتی ہیں۔ یہ ادب کی تاثیر کا انتہائی نقطہ ہے اور ادبیت کا آخری معیار۔

قرآن اور تنقید ادب

قرآن شریف خلاق دو عالم کا تخلیقی کارنامہ ہے اور بجائے خود ایک الوہی صنفِ ادب ہے۔ یہ عظیم الشان اور بے نظیر ادبی تخلیق ایک بے خطا تنقیدی تصور پر مبنی ہے۔ قرآن کا دعویٰ مع دلیل ہے کہ اس کے اندر کوئی تضاد نہیں۔ اس دعوے کے ساتھ

یہ نکتہ شامل کرلینا چاہیے کہ قرآن پوری زندگی کا ہدایت نامہ ہے اور کائنات کے حقائق کی بہترین تعبیر وتشریح اس کی آیات میں موجود ہے۔ اس نکتے پر مشتمل آیات پیش کی جاچکی ہیں۔ پوری کتاب میں مضامین کی ہم آہنگی پر دلالت کرنے والی حسب ذیل آیت نہایت فکرانگیز ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ	کیا لوگ قرآن کے مضامین پر غور
کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا	نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی
فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا	اور کی جانب سے ہوتا تو اس میں
(النساء: ۸۲)	بہت زیادہ تضاد پایا جاتا۔

بلاشبہ قرآن کے موضوعات بہت وسیع ہیں، اس کے مضامین میں تنوع ہے اور بعض نکات بار بار مختلف طریقوں سے بیان کیے گئے ہیں، پوری کتاب میں کوئی تضاد نہیں یہاں تک کہ مختلف مواقع کے بعض بیانات میں اگرچہ کچھ اختلافات نظر بھی آتے ہیں تو تھوڑے غور و فکر اور آسانی سے ان کے درمیان تطبیق اور ان کے معانی میں موافقت کے پہلو نمایاں ہوجاتے ہیں۔ قرآن جیسی وسیع الموضوعات اور کثیر المعانی کتاب کی سورتوں اور آیتوں میں یہ ہم آہنگی خالق تخلیق کی ماورائی تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے۔ یہی بصیرت قرآن کو لافانی ادبی شاہکار بناتی ہے۔

قرآنی تنقید کا سب سے اہم واقعہ سورۂ شعراء کی آخری آیات میں ظہور پذیر ہوا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ ۞	"رہے شعراء، تو ان کے پیچھے بہکے
اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ ۞	ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے
وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ۞	نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔
وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا	بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور
مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَیَعْلَمُ	جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو
الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ	کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم
یَّنْقَلِبُوْنَ ۞	کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا — اور
(۲۲۴-۲۲۷)	ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم

ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہیں۔

ان آیات کے تنقیدی نکات یہ ہیں:

۱۔ اکثر شعراء ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور انتشار فکر کا شکار ہو جاتے ہیں۔
۲۔ یہ شعراء بے عمل یا بد عمل ہوتے ہیں۔
۳۔ لیکن ایسے شاعر بھی ہو سکتے ہیں جن کا خیال بھی درست ہو اور عمل بھی۔
۴۔ بد عقیدہ اور بے کردار شعراء کی پیروی کرنے والے گم راہ ہیں۔
۵۔ نغمۂ شعر اگر ظلم کی فریاد میں اور ظالموں کے خلاف بلند ہو تو مضائقہ نہیں، بلکہ مستحسن ہے۔

آخری نکتہ عرب کے ایام جاہلیت کے پس منظر میں، ہجو نگاری سے تعلق رکھتا ہے جس پر قدیم عربی شاعری کا ایک بڑا حصہ مشتمل تھا۔ شعرائے عرب اپنی ذات اور اپنے قبیلے پر فخر کرتے ہوئے بسا اوقات دوسرے اشخاص و قبائل کی ہجو کیا کرتے تھے۔ لیکن ظلم اور ظالم کے خلاف ہجویہ شاعری کی اجازت دے کر قرآن نے ایک عام اصول بتا دیا ہے، جس کی طرف سورۂ نساء کی اس آیت (۱۴۸) میں بھی اشارہ کیا گیا ہے جس سے چھٹے پارے کا آغاز ہوتا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَ	پر زبان کھولے اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا
كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِـيْمًا ۝	ہو اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

باقی چار نکات کا واضح مفہوم یہ ہے کہ قرآن شاعری یا ادب کو ایک ذمہ دارانہ، سنجیدہ اور تعمیری عمل تصور کرتا ہے، جس کے لیے صحیح شعور اور صالح کردار ضروری ہے، ورنہ صرف لفاظی اور بے اصول نفس درازی سے شخصیت میں کجی اور سماج میں پراگندگی پھیلے گی۔ اس سے انسانیت مجروح ہو گی، تہذیب برباد ہو گی اور زندگی تباہ۔ اللہ کی کتاب ایسے تخریبی ادب کی مذمت کرتی ہے۔

انہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن نے ان افسانوں کی بھی مذمت کی ہے جو نزول قرآن کے دوران میں اس کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کفار

ومشرکین زیادہ تر ایران سے درآمد کیا کرتے تھے۔ اس طرح قرآن ایسے قصّوں کو پسند نہیں کرتا جن کا مقصد محض حسن وعشق وغیرہ کی داستان سنا کر لوگوں کو لہو ولعب میں مبتلا کرنا ہو، جب کہ خود قرآن نے بہ کثرت قصّے بیان کیے ہیں اور بعض کو "احسن القصص" (بہترین قصّہ) کہا ہے، اور عام طور پر ان قصّوں کو قصص الانبیاء کہا گیا ہے، یعنی وہ سچی کہانیاں جو مختلف ادوار میں اللہ کے نبیوں اور رسولوں کو پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہیں۔ ان سچی کہانیوں کا انداز یہ ہے کہ واقعات کے صرف وہ حصے بیان کر دیے جاتے ہیں جن کا تعلق ماضی کے عبرت انگیز تجربات سے ہے، تاکہ لوگ ان سے سبق لیں، غلط کاروں کی اصلاح ہو اور کارِ خیر کرنے والوں کے حوصلے بلند ہوں۔ یہ افسانہ کا بہترین مقصد ومصرف ہے جس سے خالی ہو کر داستان سرائی سماج میں برائیوں اور بے حیائیوں کے پھیلانے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی لغو افسانہ نگاری سے انسانی اقدار کی وہی شکست وریخت ہوگی جو شاعرانہ یاوہ گوئی سے ہو سکتی ہے۔

نظامِ تخلیق

قرآن کے تنقیدی تصورات ادبی فکر کے متعلق ہیں، لیکن ان کا اثر فن پر بھی پڑتا ہے، اس لیے کہ فن کو فکر سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اگر فکر ناقص یا سقیم ہے تو فن کی خوب صورتی انسانی زندگی کے لیے اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتی کہ بے حد خطرناک اور سخت تباہ کن ہے۔ ایسی خوب صورتی درحقیقت بدصورتی کا پردہ ہے، جب کہ پس پردہ نظر آنے والی مکروہ حقیقت کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال، اپنے تنقیدی تصورات کے تحت قرآن حکیم کا ادب ایک مکمل نظامِ تخلیق پیش کرتا ہے، جس میں کائنات اور حیات، یہاں تک کہ ازل و ابد، کی ساری وسعتیں سمٹ آئی ہیں۔ دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسا مکمل نظام نہیں پیش کر سکی ہے۔ طبعیات سے مابعد الطبعیات تک، زندگی اور ادب کی تمام اخلاقی وجمالیاتی اقدار قرآنی نظام میں موجود ہیں۔ یہ اقدار ہر فرد اور ہر سماج کے مقدر کی تعمیر کا نسخۂ کیمیا ہیں۔ عہدِ وسطیٰ سے دورِ جدید تک علوم و فنون اور آداب و اطوار کی ساری ترقیات انہی اقدار پر مبنی رہی ہیں۔ یہ اقدار دراصل عناصر کی طرح آفاق کی تمام جہتوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور مختلف حالات میں مختلف اقوام و

ممالک نے اپنے فروغ وعروج کے لیے ان سے پیہم استفادہ کیا ہے۔ تاریخ عالم میں صلاح وفلاح کی ہر کوشش انھیں قدروں سے وابستہ رہی ہے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی انحراف کے نتیجے میں ان قدروں کی خلاف ورزی یا ان سے روگردانی کی گئی ہے تو وہ فساد وزوال کا باعث ہوئی ہے۔

قرآن کا ادبی نظام دراصل اس نظام کائنات کا عکس ہے جو رب العالمین نے ترتیب دیا ہے۔ اس لیے وجود عالم کی پہنائیاں، گہرائیاں اور بلندیاں اس نظام میں مضمر ہیں۔ جملہ موجودات ومخلوقات کی آگہی اس نظام کے فہم سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے متشابہات کی تاویل سے قطع نظر، اس کے محکمات انسانی شعور وکردار کی تشکیل وترقی کے لیے کافی ہیں۔ فرد کی تربیت اور معاشرے کی تزئین کے تمام اسرار ورموز نظام قرآن کے مضمرات میں پنہاں ہیں۔ جو شخص جس حد تک ان اسرار ورموز سے واقف ہوکر ان کے مطابق اپنی پوری زندگی کا نہج درست کرنے کی سعی کرے گا اس کے علم وعمل کا اعتبار اتنا ہی بڑھے گا اور اس کی ذات اس حد تک کائنات کی تسخیر کرتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ وہ دنیا کی حدود سے قدم آگے بڑھا کر آخرت کی سرحدوں میں داخل ہوجائے گا، جس کے احوال ومقامات کا کچھ احساس اگر ہوسکتا ہے تو ایمان کی قوت وبرکت سے، اور قرآنی ادب کا مقصد ایمان ہی کی تازگی وشادابی ہے۔

تصنیفی تربیت کے اسکالرشپ میں اضافہ

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی طرف سے زیر تربیت طلباء کو چار سو روپئے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اب اسے بڑھا کر پانچ سو روپئے کر دیا گیا ہے۔ یہ وظیفہ دو سال کے لیے ہوتا ہے۔ منتخب ہونے والے افراد کو ادارہ کی طرف سے قیام کی سہولت رہے گی۔ درخواست دہندہ کا کسی معروف عربی مدرسہ کے درجہ فضیلت یا اس کے مساوی درجہ سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ہائی اسکول کے معیار کی انگریزی کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔ عربی نہ جاننے کی صورت میں درخواست دہندہ کا ایم اے ہونا ضروری ہے۔ بی اے پاس شدہ افراد بھی درخواست دے سکتے ہیں، بشرطیکہ عربی میں اچھی استعداد رکھتے ہوں۔

تحریک اسلامی سے متعلق یا کسی معروف شخصیت کی تصدیق کے ساتھ حسب ذیل معلومات فراہم کی جائیں۔ (۱) نام (۲) عمر (جو بیس سال سے زیادہ نہ ہو) (۳) پورا پتہ۔ (۴) تعلیمی استعداد (اسناد اور مارکس شیٹ کی نقل کے ساتھ) (۵) کورس کے علاوہ مطالعہ کی تفصیل (۶) مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مضامین کی نقل، کسی بھی زبان میں۔ (۷) ان موضوعات کی تفصیل جن سے درخواست دہندہ کو دلچسپی ہو۔

درخواستیں جلد از جلد بھیجی جائیں۔ جلال الدین عمری سکریٹری ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ علی گڑھ